⊙ ڈاکٹر جاوید اقبال جاوید
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
⊙⊙ ڈاکٹر الماس خانم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور
⊙⊙⊙ ڈاکٹر عظمیٰ بشیر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

نوآبادیاتی اور شعریاتی تناظر میں انیسویں صدی کے نظری مباحث

Abstract:

Nineteenth-century theoretical discourse in a colonial and poetic context .When nineteenth-century ideological debates are discussed in a colonial and poetic context, the names Azad, Hali, and Shibli come to the fore. The search for references to poetry in Urdu literature and the study of its applied forms rely heavily on contemporary literary criticism. The poetic landscape of the 19th century does not reflect the oppression of the colonial system, but it is nonetheless a favor of the West and a response to the impulses of colonial thought. There is also room for preference. There is also room for experimentation on ghazal structure and identification. The mind is also interested in resources. The main theme of ghazals is love, and the sweetness of the love element of ghazals is called tagzal. Ghazal, an Urdu language, also has expressions for sex, but sex here is a human emotion, not an animal one. But above all, it has become a center of pleasure and soul aesthetics. Ghazal's sexual passion, the quest for beauty, the concept of caste perfection, the breadth, universality, and balance of his intellectual area was created.

Keywords:

Theory, Discourse, Colonial, Context, Ideology, Poetry, Poetic, Azad, Hali

نوآبادیاتی عہد کے تناظر میں شعریات کے اجزائے پریشاں کو ایک مربوط شکل دینے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ شعریات بذاتِ خود کیا ہے اور کسی فن پارے کا مطالعہ شعریات کے تناظر میں کیوں ضروری ہے۔ادب کے تناظر میں جس طرح لسانیات زبان کا علم ہے بالکل اسی طرح شعریات اَدب کا علم ہے۔لسانیات میں زبان کی بنیادی ساخت اور اس کے رموز سے متعلق بحث ہوتی ہے اور شعریات میں ادب کی بنیادی ساخت،خارجی حوالہ جات اور دیگر رموز سے متعلق بحث کی جاتی ہے۔شعریات کے مباحث بنیادی طور پر لفظ و معنی کا کلامیہ ہیں اس کی جڑیں سنسکرت،عربی اور قدیم یونانی سے جا ملتی ہیں۔شعریات ادب میں بندھے ٹکے لسانی ساخت کو رد کر دیتی ہے اور ساخت میں تنوع اور ندرت پیدا کرتی ہے۔شعریات ایک وسیع موضوع ہے،جس میں غزل کے صنفی تصور،اس کی تشکیل کے اسباب و محرکات،اجزائے ترکیبی اور ترمیم و اضافے کا تجزیاتی مطالعہ بصارت و بصیرت سے ہم کلام ہو کر ادبی صنف کے وجودیاتی و علمیاتی عناصر کو نئے منطقوں سے مربوط کرنا ہے۔ادب میں کسی بھی صنفی ادب کا تشخص اس کے اجزائے ترکیبی کے داخلی و خارجی عوامل کی یکجائی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔اسی طرح غزل کا شناخت نامہ اس کی ہیئت اور ساخت ہے۔ادب میں کسی بھی مخصوص ساخت کی تشکیل کا عمل تہذیبی،تاریخی،ادبی و لسانی تسلسل کے امتزاجی اور انحرافی رویوں کا عکاس ہے۔

ہر صنف شاعری مختلف اصناف شاعری کے انضمات رکھتی ہے۔صنف کے تصور کا ادراک ادبی صنف کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔یہاں تک کہ ارسطو کے زمانے سے صنف شاعری کے موضوع پر افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری ہے۔جب کہ اُردو میں اس موضوع پر کم توجہ دی گئی۔تاریخ کی ورق گردانی سے واضح ہوتا ہے کہ مغرب میں شعریات کا آغاز ارسطو کی ''بوطیقا'' سے ہوا۔ارسطو نے ''بوطیقا'' میں طربیہ،المیہ اور رزمیہ جیسے جن موضوعات پر گفت گو کی وہ آج بھی انتہائی اہم ہیں۔مغربی شعریات کی نمو د یونان اور روم میں ہوئی اور مسلسل ارتقائی مراحل طے کرتی رہی۔مغرب میں شعریات کا یہ سفر صدیوں کے تجربات پر محیط ہے،اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی شعریات کا ڈھانچہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے جب کہ اس کے مقابل اُردو میں شعریات کے نظریات بہت بعد میں پروان چڑھے۔

نظری مباحث کی روایت میں شعریات کا اِدراک مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے اشعار میں واضح طور پر ہوتا ہے۔اس کے پس منظر پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شعریات کے تانے بانے امیر خسرو سے جا ملتے ہیں۔نظری تنقید نے شعریات کی مشرقی روایتوں اور خاص طور پر سنسکرت،عربی اور فارسی سے چراغ روشن کیے۔اُردو شعریات سے خسرو کی فکریات کو کسی طور الگ نہیں کیا جا سکتا۔اس لحاظ سے دیباچہ ''غرۃ الکمال'' کو اُردو شعریات کا اولین ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔خسرو نے اَدبی تہذیب کے ساتھ ساتھ شاعری کے اہم نکات پر سیر حاصل بحث کی۔خسرو نے ''غرۃ الکمال'' کے دیباچہ میں صنعت سے پیدا ہونے والی معنوی خوبی،خامی اور صنعت اشتقاق کی لفظی تشکیل و ترکیب اور شعر میں ان کے استعمال کو بھی واضح کیا ہے۔خسرو نے فکر و فن اور شعر و حکمت کے متعلق موشگافیوں پر نگاہ ڈالی۔

اُردو اَدب میں شعریات کے مراجع کی تلاش اور اطلاقی صورتوں کا مطالعہ جدید اَدبی تنقید کا مرہونِ منت ہے۔اُنیسویں صدی میں شعریات کو شعبۂ علم کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی،جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر دور کی اپنی تنقیدی بصیرت ہوتی ہے،اس لیے کسی بھی عہد کو اس کے بعد کم تر کہہ دینا کسی طور مناسب نہیں۔خاص طور پر اُردو تذکروں کی تنقید

پر نوآبادیاتی عہد میں توجہ دی گئی۔اس حوالے سے یہ بات قابل غور ہے کہ گارساں دتاسی وہ پہلا مستشرق تھا جس نے تذکروں پر ادبی اور تنقیدی لحاظ سے نگاہ ڈالی۔

ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوا جو ہندوستان میں تہذیبی وتمدنی اعتبار سے انتہائی اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے اس نوآبادیاتی عہد میں مغربی استعماریت اور سامراجیت نے پورے ہندوستان کو نہ صرف غلامی کی زنجیر میں بری طرح جکڑ لیا بلکہ پورے ہندوستان کو زوال کا نشانہ بنا دیا۔نوآبادیاتی عہد میں استعماری طاقتوں نے برصغیر کی سیاسی وسماجی اور اخلاقی وعلمی حقیقتوں کو اپنے حسبِ منشا صورت گری کی کوشش کی۔نوآبادکاروں نے برصغیر کے اہل فکر و دانش اور ادیبوں کی تخلیقی تشکیل کے لیے بھی مواد فراہم کیا۔علمدار حسین بخاری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''برصغیر میں اہلِ دانش اور اہلِ قلم نے بزعم خویش آزادانہ طور پر مغربی دانش اور اَدبی تحریکوں سے اثر پذیری اختیار کی لیکن وہ عام طور پر بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر گئے آزاد اور غلام معاشروں میں سماجی نمو اور ارتقا کے انداز اور تقاضے مختلف اور بعض اوقات متضاد بھی ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں سامراجی اقتدار کے استحکام کے ساتھ ساتھ مفتوحہ علاقوں کے لوگوں میں ایک ایسی غلامانہ ذہنیت نے فروغ پایا کہ جس کے باعث خود ہندوستانیوں کو کیسہء مشرق میں موجود سارے سکے نظر آنے لگے۔''(۱)

نوآبادیاتی دور میں شاہی عتاب سے بچنے کے لیے شعرا نے غزلیہ کرداروں کو معنیاتی اور قلب و ماہیت کے لحاظ سے تبدیل کر دیا۔اس دور میں حسن وعشق کی غیر روایتی وارداتیں اور عاشق و معشوق کی غیر معمولی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ یوں نوآبادیاتی عہد کا عشق بھی شاعری کے روایتی عشق سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔محمد رؤف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''نوآبادیاتی تناظر میں یہ اصطلاحاتِ جنوں اپنے معنوی انسلاکات میں کچھ یوں بیان کی جاتی ہیں:عاشق (انقلابی) معشوق (وطن، مقامی حکمران، نوآبادکار)، رقیب (نوآبادکار)، وصل (حصول آزادی)، ہجر (حالات استحصال)، حسن (سماجی انصاف) گل (نصب العین، سیاسی آدرش)، عندلیب (انقلابی ادبا)، گل چیں، صیاد (آزادی مخالف قوتیں) وغیرہ۔''(۲)

نوآبادیاتی عہد میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کو اُردو شعریات کی احتسابی کارگزاری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔اس سے پہلے مطالعہ کائنات، تفحص الفاظ تخیل کی شرط نہیں تھی، اور نہ ہی اَصناف اَدب کے استعارے اور وجودیاتی پہلوؤں کے وسیع تر تصور پر غور وفکر کیا گیا تھا۔اُنیسویں صدی میں شعریات کے جو خدوخال متعین ہوئے انھیں نوآبادیات کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔اس عہد کے شعرا میں سے محمد حسین آزاد کے تصورات وخیالات سے نوآبادیاتی عہد کی عکاسی ملتی ہے۔ابوالقاسم قاسمی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''نوآبادیاتی فکر کی ترویج واشاعت میں محمد حسین آزاد کے استغراق کا یہ عالم ہے کہ جدید نظم کی پوری تحریک میں ان کی نگاہ سے نظم نگاری کی وہ اُردو روایت یک سر اوجھل ہو جاتی ہے جس کی مثال کے طور پر قلی قطب شاہ سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک کی کاوشوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔آزاد نے اپنی تحریک میں ویسے تو مثنوی کی ہئیت کو موزوں اور مناسب سمجھا اور استعمال کیا لیکن اُردو نظم

کی روایت میں شامل مثنوی اور شہر آشوب اور خود نظم کی مختلف اور متنوع ہیئتوں میں پیش کیے جانے والے نمونوں سے اغماض برتا۔‘‘(۳)

مولانا محمد حسین آزاد اپنی نظموں کو حسن و عشق سے آزاد گردانتے تھے۔ اُن کے مطابق شاعری میں حسن و عشق کے بجائے فطری شاعری پر زور دیا جانا چاہیے۔ اسی تناظر میں الطاف حسین حالی نے اَدب کو قوم کی اصلاح، مفاد عامہ اور اخلاقیت اور مقصدیت کا آلہ کار قرار دیا۔ مولانا محمد حسین آزاد انگریزی اَدب سے مرعوب تھے اور وہ ڈاکٹر لائٹنر اور ہالرائیڈ سے بہت متاثر تھے۔ آزاد نے بین العلومی مطالعے، بین اللسانی اور مشرق و مغرب کے امتزاج پر زیادہ زور دیا۔ الطاف حسین حالی نے سادگی، اصلیت اور جوش کو اچھے شعر کی پہچان قرار دیا۔ اختر انصاری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

’’حالی کی ناقدانہ اہمیت کا راز دراصل اس امر میں ہے کہ وہ ایک ترقی پسند نقاد تھے۔ ان کا اَدبی اور تنقیدی شعور ترقی پسندانہ افکار و تصورات پر مبنی تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حالی کا سماجی اور اجتماعی احساس بیدار تھا۔ وہ اپنے زمانے کی تاریخی قوتوں اور بنیادی حقیقتوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ زندگی ایک تاریخی دور سے نکل کر دوسرے تاریخی دور میں داخل ہو چکی ہے۔‘‘(۴)

اُردو میں تنقید کا آغاز باقاعدہ طور پر الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے۔ حالی سے قبل اُردو میں اَدبی تنقید، اُصول و نظریات کی شیرازہ بندی سے بالکل محروم نظر آتی ہے۔ شاعری کے حوالے سے آزاد کے نظریات منتشر نظر آتے ہیں لیکن حالی کے ہاں یہ نظریات مربوط ہیں۔ حالی اُصول نقد اور شعر و شاعری کی ماہیت پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ حالی کا خاصہ یہ کہ وہ اپنے مقصد سے ہم آہنگ کرنے کے لیے غیر متعلق افکار و خیالات کا رُخ اپنے مدعا کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ وہ شعر کو ایک مطلق چیز قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک شعر اخلاقی و غیر اخلاقی اور عشقِ حقیقی و مجازی سے بھی ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلق کی داستان بھی بیان کر سکتا ہے۔ ابوالقاسم قاسمی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

’’الطاف حسین حالی نے ’مقدمہ شعر و شاعری‘ میں اُصولی اور اطلاقی دونوں اعتبارات سے اَدبی نظریہ سازی، روایت کے جس شعور اور جس دقت نظر کے ساتھ کی ہے وہ ہماری نگاہوں سے مخفی نہیں لیکن حالی بھی جس طرح پیروی مغربی کو اُردو شاعری اور نئی معیار بندی کا پیمانہ بنا کر پیش کرتے ہیں وہ بھی غیر شعوری طور پر امپریل ایجنڈا کی تکمیل میں تعاون کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اَدبی استناد بندی کے جو معیار ’آب حیات‘ اور ’مقدمہ شعر و شاعری‘ کے ذریعے قائم ہوئے ان کی ہمہ گیری نے آج تک ہماری تنقید کے ارتقا کو اپنی گرفت میں رکھا ہے۔ آزاد کی تاریخ نگاری میں ان کی زبان اور اُسلوب بیان کا جو موثر اور توانا رول تھا، کم و بیش وہی رول حالی کی منطقیت اور استدلال نے ’’مقدمہ شعر و شاعری‘‘ کے ذریعے ادا کیا۔‘‘(۵)

الطاف حسین حالی اُردو کے اُن اولین ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے سنجیدگی سے شعر کی ماہیت پر بحث کی۔ انھوں نے شاعری میں خیال اور مادہ کے تعلق کو ظاہر کیا۔ اس دور میں شعریات کے حوالے سے نئے رجحانات اور نظریات کا آغاز ہوا۔ اس جدید عہد میں زبان و بیان کی بحث میں لفظ و معنی کے متعلقات کا مطالعہ ناقدین کا محبوب ترین مشغلہ بن گیا۔ اس مطالعے میں استعارے کے متعلق بحث انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ اس تناظر میں اُنیسویں صدی کا شعریاتی منظرنامہ نوآبادیاتی

نظام کے جبر کا آئینہ دار نہیں تو کم از کم نوآبادیاتی افکار کے محرکات کا ردعمل ضرور ہے۔محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی کسی نہ کسی طور انگریزی ادب سے متاثر ہو چکے تھے۔جدید شعریاتی اور نوآبادیاتی منظرنامے کے تناظر میں دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اُردو شاعری میں آزاد، حالی اور شبلی اہم ترین شعریاتی حوالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔شعریات مکمل ادبی کارگزاری کا نام ہے، جس میں استعاراتی، تمثیلی، علامتی اور اساطیری عناصر کا اظہار کیا جاتا ہے۔خلیل الرحمان اعظمی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہیئت کے پیچھے اچھے موضوع کو تباہ نہیں کرنا چاہیے۔انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر موضوع صالح بھی ہو اور زندگی کی صحت مند قدروں کی عکاسی بھی کرتا ہو۔اگر اسے پیش کرتے وقت ایک خاص پیکر اور خاص انداز میں ڈھالنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے جو زیادہ سے زیادہ متاثر کن ہو تو پھر وہ ایک بھونڈی سچی بات ہوگی لیکن ادب نہ ہوگا۔''(۶)

مولانا محمد حسین آزاد نے غزل کی روایتی شاعری کو اُردو شاعری کے نمونے کے طور پر پیش کرنے کی شعوری کوشش کی۔انھوں نے انگریزی شاعری کی تقلید کی اور مغربی شعر و اَدب کا کھلے لفظوں میں اعتراف بھی کیا۔آزاد شاعری کے بامعنی ہونے کی نسبت اس کی اثر اندازی پر زور دیتے ہیں۔وہ بنیادی طور پر شاعر کے قوت تخیلہ کی دسترس کو ظاہر کرنے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔وہ شاعری کو نہ صرف مابعد الطبیعاتی چیز سمجھتے ہیں بلکہ شاعری کا تعلق اخلاقیات سے منسلک کر دیتے ہیں۔وہ حالی کے حامی ضرور ہیں لیکن حالی اور شبلی کی طرح اخلاقیات اور شاعری پر تفصیلا بحث نہیں کرتے۔ان کے نزدیک شاعری میں صالح اقدار اور اخلاقی لحاظ سے پسندیدہ خیالات کا اظہار ہونا چاہیے۔آل احمد سرور اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''شاعری کا عمل کلام کے ذریعے جذبے یا تخیل کو یا ان کی آمیزش کے ساتھ فکر کو متحرک کرنا ہے۔یہ عمل نثری کلام کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ بہت سا نثری کلام ایسا ہے جن میں شعریت محسوس ہوتی ہے۔ظاہر ہے کہ ایسا نثری کلام تمام و کمال شعریت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ شاعری کا ایک آدھ عنصر اس میں شعریت پیدا کر دیتا ہے۔شعری کلام کا معاملہ اس کے برعکس ہے، یعنی اس میں شاعری کے بیشتر یا سب عناصر موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی ایک غیر شاعرانہ عنصر اس کی شعریت کو سلب کر سکتا ہے۔''(۷)

نوآبادیاتی عہد میں شبلی نعمانی کی فکرِ شعریات میں فارسی شعر و اَدب کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے کیوں کہ ان کی تعلیم اور تربیت مشرقی علوم اور مشرقی تہذیب کے زیرِ اثر ہوئی۔شبلی نعمانی کے مقالات میں عربی زبان و اَدب، عربی شاعری اور فن بلاغت کی تفصیل سے بحث ملتی ہے۔شبلی کے حوالے سے یہ رائے عام طور پر قائم کی جاتی ہے کہ انھیں عربی اَدب و تنقید سے زیادہ فارسی شعر و اَدب سے شغف تھا اور یہی ان کا حقیقی میدان تھا۔شبلی، حالی کے ہم عصر تھے لیکن حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو شبلی کی تصنیفات پر تقدم حاصل ہے۔شبلی نعمانی نے اُصول تنقید کے بنیادی مباحث کے حوالے سے عربی کتب پر انحصار کیا۔ان کے مقالات میں شعر کی ماہیت، فصاحت و بلاغت کی تعریف واضح طور پر ملتی ہے جن میں قدیم عربی نقادوں کے حوالے موجود ہیں۔خلیل الرحمان اعظمی شبلی کی تنقید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شبلی کی تنقید حالی کی تنقید کا ردِ عمل معلوم ہوتی ہے۔شعر العجم براہ راست تو نہیں لیکن بالواسطہ مقدمہ شعر و شاعری کا جواب ہے چوں کہ حالی کے اعتراضات کا ہدف وہ اَدبی و شعری روایات

ہیں جن کی جڑیں دور تک فارسی شاعری میں پھیلی ہوئی ہیں، اس لیے روایات کی نوعیت اور حقیقت کو سمجھنے کے لیے فارسی شاعری کا مطالعہ ہی سود مند ہوگا۔"(۸)

شبلی نعمانی شعر کی ماہیت کی حد بندی متعین کرنے کے لیے عربی و فارسی زبان کے علما سے رجوع کرتے ہیں اور ان تصورات میں نقائص نظر آئیں تو وہ ارسطو کے تصورات کا سہارا بھی لیتے ہیں۔شبلی شاعری کے اصل عناصر محاکات، وزن، خیال بندی، صاف بندش، سادہ الفاظ اور طرزِ ادا پر بحث کرتے ہیں۔وہ ارسطو کے خیال کو مستعار لیتے ہوئے مصوری کو شعر کی بنیادی اور اصل صفت قرار دیتے ہیں، لیکن اس میں تخیل شامل نہیں۔شبلی تخیل اور محاکات کو شعر کا لازمی جز قرار دیتے ہیں ان کے مطابق ان میں سے ایک صفت بھی پائی جائے تو وہ شعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔عبادت بریلوی شبلی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"وہ تخیل کو اختراع کا نام دیتے ہیں، اور ہنری لوئس کے اس قول سے اتفاق نہیں کرتے کہ قوتِ تخیل، اس قوت کا نام ہے جو غیر مرئی اشیا کو ہماری نظر کے سامنے کر دے۔قوتِ تخیل ہی شاعری میں مضامین شاعرانہ پیدا کرتی ہے۔شبلی کا خیال ہے کہ شاعر قوت تخیل سے تمام اشیا کو نہایت دقیق نظر سے دیکھتا ہے۔وہ ہر چیز کی ایک ایک خاصیت ایک ایک وصف پر نظر ڈالتا ہے۔پھر اور چیزوں سے ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ان کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالتا ہے......بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی کا یہ خیال کہ تخیل محاکات شاعری کے لیے ضروری ہیں اپنی جگہ پر اہم ہے شعر انھیں سے مرکب ہوتا ہے۔البتہ اس میں فنی پہلو پیدا کرنے کے لیے جدت ادا، بندش شیریں، سادہ اور مترنم الفاظ وغیرہ کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔"(۹)

نوآبادیاتی عہد میں اُردو غزل کی صنف کے نئے رُجحانات منظر عام پر آئے۔یہی استعمار زدہ غزل کے کردار اور منتشر انفرادی جذبے آگے چل کر تنظیم اور تحریک کی شکل اختیار کر گئے۔یہی حسیات مولانا ظفر علی خان اور اقبال جیسے شعرا کے اُسلوب میں ظاہر ہونے لگے۔غزل کی تشکیل میں نوآبادیاتی عہد کی کارگزاری کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔یہی وہ عہد ہے جب حالی نے غزل کی حدود و قیود کو توڑنے کا فریضہ سرانجام دیا۔جس کے نتیجے میں غزل داخلی، خارجی اور اجتماعی اظہار کا وسیلہ بنی اور اس کی اُسلوبیات اور فکریات میں امکانات، ترامیم و اضافے اور ترجیحات کی گنجائش پیدا ہوئی۔آزاد غزل، مستزاد، قطعہ بند، بحرین غزل، آزاد غزل، نثری غزل، معرا غزل، دوہا غزل، غزل نما، ماہیا اور غزلیہ کی بھی مثالیں موجود ہیں، جو غزل کی ہیئتی تشکیلات ہیں۔غزلیہ شاعری میں ایک سے زیادہ بھی مطلع کہے گئے اور مطلع اور مقطع کے بغیر بھی غزلیں کہی گئیں۔اسی طرح دوغزلہ، سہ غزلہ، غزل مسلسل اور غزلِ غیر مسلسل کی روایت بھی موجود ہے۔یہ تمام بیان کردہ غزلیں اضافی ہیں اور جب تک غزل کا سفر جاری رہے گا اس وقت تک اس میں نئے امکانات کی گنجائش موجود رہے گی۔مردف اور غیر مردف غزلوں کی روایت بھی موجود ہے۔اُردو شاعری میں غزل کے اشعار کی کوئی متعینہ اور آفاقی تعداد طے نہیں پائی۔وزیر آغا اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اُردو غزل کے تدریجی اِرتقا میں ایسے ادوار بھی آئے ہیں جن میں غزل، توازن کی اِس صفت کو ملحوظ نہیں رکھ سکی یعنی کبھی تو خالص بُت پرستی اور کبھی خالص تخیل پسندی کی رَو میں بہ گئی ہے، تاہم بحیثیت مجموعی، اس

نے اپنی بنیادی صفت سے انحراف نہیں کیا اور اس کی کامیابی کی وجہ جواز بھی یہی ہے۔"(۱۰)

غزل کی ساخت کو ایک صنف کے طور پر برتا گیا ہے۔ظاہری بات ہے غزل کی ساخت کسی شاعر نے ضرور بنائی ہوگی۔غزل کسی رشتہ سے قصیدے کی ساخت میں موجود ہے یہی وجہ ہے کہ اسے اپنی روایت قائم کرنے میں دیر نہ لگی۔یوں رشتوں کے وجودیاتی اور آفاقی نظام سے کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا۔ادب میں صنف بنیادی اُصولوں کا مجموعہ ہے۔غزل میں فکر، خیال، قافیہ، ردیف اور بحر مختلف ہو سکتے ہیں لیکن بنیادی اُصول یکساں ہیں۔اسی طرح غزل میں اُسلوب تبدیل تو ہو سکتا ہے لیکن موجود رہتا ہے۔اُردو غزل میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ مختلف تجربات ہوتے رہے۔کامیاب تجربات روایات کا حصہ بن جاتے ہیں اور ناکام تجربات کی عمر مختصر ہوتی ہے، مثلاً آزاد اور نثری غزلیں۔اظہار کے مختلف ذرائع ہیں جیسے غزل اور قطعہ میں واضح فرق ہے، لیکن دونوں میں خیالات، احساسات، محسوسات اور تجربات کی عکاسی ہوتی ہے۔ایک صنف سے دوسری صنف کا وجود ممکن ہوتا ہے، اس میں بنیادی شے تخلیق ہے۔تخلیقی محرکات سے اظہار کے سانچوں یا اصناف کا تعین ہوتا ہے۔یحییٰ امجد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"غزل کے ربطِ نہاں یا داخلی منطق سے یہ مراد ہے کہ غزل کے جملہ شعروں میں جتنے بھی اَفکار یا باطنی تجربے منکشف کیے گئے ہیں، ان کا لاشعوری پس منظر ایک ہوتا ہے۔وہ شاعر کے نظامِ جذبات میں سے صرف ایک ہی مسئلہ احساس کے مختلف اور بہ ظاہر غیر مربوط مگر بہ باطن خفیف سا ربط رکھنے والی اکائیاں ہیں۔"(۱۱)

شاعری تنقیدی موضوعاتی اور ہنگامی مسئلوں میں اُلجھ جاتی ہے کیوں کہ وہ صنف کے وجودیاتی مسائل نظر انداز کر دیتی ہے۔اس وقت غزل کی ہئیت کے متعلقہ امکانات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اُردو غزل ہند اسلامی اور ایرانی تہذیب کی دین تصور کی جاتی ہے۔ایران میں شاعری کا آغاز صنف قصیدے سے ہوا۔قصیدے کے آغاز کا بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ قصیدے کی ابتدائی شاعری میں سے عشقیہ شاعری الگ کر دی گئی تو صنف غزل معرض وجود میں آئی۔فارسی غزل کا باوا آدم رودکی کو تصور کیا جاتا ہے۔اس کے دور میں غزل نے ایک مکمل ادبی صنف کی شکل اختیار کر لی تھی۔آغاز میں قصیدے کے عناصر غزل میں بھی پائے جاتے تھے کیوں کہ دونوں اصناف کا بنیادی مقصد مداح تھا۔قصیدے میں بادشاہ اور امرا کی تعریف کی جاتی تھی جب کہ غزل میں محبوب کی تعریف کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ان تمام موضوعات کی پیش کش کے لیے غزل انتہائی مناسب صنف اَدب تھی۔مبالغہ آرائی کا پہلو نمایاں طور پر دونوں اصناف اَدب میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔بادشاہت کے دور تک قصیدے کی صنف کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔بادشاہوں کی شان و شوکت، بہادری، عدل و انصاف، سخاوت اور اقتدار کے قصیدے پڑھے جاتے رہے۔اس طرح اقتدار کے خوف، غلامی اور جنگ و جدل کے ماحول نے عشقیہ واردات کے بیان کو پنپنے نہیں دیا۔ان تمام موضوعات اور ان سے پیدا ہونے والے مضامین کے لیے غزل بہترین صنف ادب ہے۔تشبیب میں عشق کے پہلوؤں کا بیان تفریح طبع کے لیے نہایت موضوع تھا۔قصیدے کی تشبیب میں شاعر کو تخلیقی موضوعات کے حوالے سے آزادی ہوتی ہے۔انور جمال اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"عربی قصیدے کا اَولین حصہ تشبیب فارس میں قصیدے سے الگ ہو کر غزل کے روپ میں جلوہ نما ہوا اور اُردو ادب کے دامنِ بہار میں گل ریزی کرنے لگا۔اُردو غزل واحد صنفِ سخن ہے جو

غمِ جاناں،غمِ ذات اورغم دوراں کوتخلیقی اظہار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔"(۱۲)

شاعری کی اصطلاح میں تشبیب کا مفہوم بنیادی طور پر قصیدے کے آغاز میں عاشقانہ اور حسن وعشق کے مضامین نظم کرنا یا جوانی کے زمانے کا ذکر شاعرانہ انداز میں کرنا ہے، جب کہ غزل کا مفہوم عورتوں سے متعلق باتیں کرنا کے ہیں۔ اس پس منظر کے تناظر میں کلاسیکی غزل اساس کا فلسفیانہ جواز بڑی آسانی سے واضح ہو جاتا ہے۔غزل کے ساتھ ساتھ عشق کے متعلقات اور اضافی تصورات بھی فارسی سے اُردو میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔اُردو شعرا نے اُردو شاعری کے موضوعات کو وسعت کے اعتبار سے اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ،تصوف اور بے ثباتی دنیا کے مضامین بھی اُردو غزل میں معنی خیز ثابت ہوئے۔کوئی بھی زبان اظہار کا نامکمل اظہار ہے اور شاعری میں اظہار کا وسیلہ زبان ہے۔اس لیے اپنے احساسات، جذبات، کیفیات،محسوسات اور تجربات کے اظہار کے لیے شاعری،مصوری،موسیقی اور رقص جیسے وسائل کا استعمال بطور خاص ہوتا ہے۔غزل اختصار اور اشاروں کی عکاس ہے۔اس میں تشبیہ،استعارہ،علامت اور ابہام کے دیگر وسائل سے بھی دل چسپی ہے۔غزل ناقدانہ جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے اور غزل میں عشقیہ عناصر کی لطافت کو تغزل کا نام دیا جاتا ہے۔اُردو غزل میں جنس کی بھی ترجمانی ملتی ہے لیکن یہاں جنس حیوانی نہیں بلکہ انسانی جذبات کی پیش کش کرتی ہے۔غزل اب ہوا و ہوس سے بالاتر ہو کر جذبے کی لطافت اور جمالیات کی محور بن گئی ہے۔غزل میں جنسی جذبہ،حسن کی تلاش اور تکمیلِ ذات کے تصورات کے باعث فکری دائرے میں وسعت، ہمہ گیری اور توازن پیدا ہو گیا۔فارسی کی ابتدائی شاعری میں عشقیہ جذبات کی ترجمانی ملتی ہے لیکن اُردو شعرا نے اسے دل اور دلی کا مرثیہ بنا دیا۔وہ ایک شعر میں اپنے تجربے کے حوالے سے کئی موضوعات بیان کرنے کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ڈاکٹر عنوان چشتی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"تخلیقی عمل میں خالص جمالیاتی دل چسپی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔یہ فنکار کے تخیل کو مکمل طور پر تخلیقی عمل میں لگا دیتی ہے۔ہر فرد، جگہ، چیز یا واقعہ میں ایک ایسی ناگزیر حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے، جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔فن کی بنیاد اس ناگزیر حقیقت پر ہے جو شعری تجربے کی بنیادی خصوصیت بن جاتی ہے۔یہ ناگزیر حقیقت ہی کسی فرد، جگہ، چیز یا واقعہ کا مقدر ہوتی ہے...... شاعری میں جذباتی معنویت اور اظہاریت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔یہ فنکار کی تخلیقی اُپج پر منحصر ہے کہ وہ کتنی کامیابی سے اس کارگہ شیشہ وآہن سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔اس اظہاریت کی تکمیل یا تخلیق میں فنکار اس نصاب تبدیل نہیں کرتا جو اس کو خالص ہیجان کی صورت میں ملا تھا اور جس کے ساتھ کھر درا احساس کبھی بھی شامل تھا یہی وہ شے ہے جس سے فنکار فن پارہ کی تخلیق کرتا ہے۔"(۱۳)

بنیادی طور پر شعر کی ہئیت غزل کے صنفی وجود سے پہلے اُردو قصائد میں موجود تھی۔شعر کو فرد اور بیت بھی کہا جاتا ہے۔شعر کی ساخت دو موزوں مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔اسی طرح ایک مصرعہ کم از کم دو اَرکان پر مبنی ہوتا ہے۔یوں ایک شعر میں کم از کم چار اَرکان ہوتے ہیں۔اس حوالے سے غزل کے وجودیاتی تصورات کی نشان دہی کی جائے تو شعر کہنے کے لیے سب سے پہلے چند بامعنی الفاظوں کی ضرورت محسوس ہو گی۔ان کو جوڑنے کے لیے ربط کا سہارا بھی درکار ہوتا ہے۔شعر

میں خیالی ارتباط کے ساتھ آہنگ میں ربط برقرار رکھنے کے لیے وزن اور بحر سے بھی کام لینا پڑے گا۔غزل کی تشکیل کے لیے آخری اور لازمی شرط قافیہ ہے۔ردیف کا استعمال قافیہ کے بغیر ممکن نہیں۔ردیف سے غزل میں خوش آہنگ اور روانی و تسلسل پیدا ہو جاتی ہے۔کلاسیکی شعرا کے علمیاتی تصورات میں مضمون آفرینی،معنی آفرینی (رعایت،مناسبت،ایہام) خیال بندی اور کیفیات شامل ہیں۔یہ تصورات نئی لفظیات و تراکیب کے ساتھ کلاسیکی غزل کی طرح جدید غزل کے لیے بھی انتہائی اہم ہیں۔یہ تمام شعری اجزا ہند اسلامی تہذیب کی شعریات کا ورثہ ہیں۔ڈاکٹر عنوان چشتی اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

''اُردو میں مصرع کی بنیاد وزن پر ہے۔غزل کے دونوں مصرعوں میں نظم کے ایک بند یا ٹکڑے میں ایک خیال کو پیش کیا جاتا ہے۔اس لیے غزل کے دونوں مصرعوں میں الفاظ کو جملہ کی نثری ترتیب کے مطابق دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے،اور نظم کے بند ٹکڑے یا پورے عضوی کُل کے مساوی الوزن مصرعوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔شاعر الفاظ کو وزن کے مطابق مصرعوں کے سانچے ڈھالتے وقت ایجاز اور فنکارانہ صلاحیت سے کام لیتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جذبہ یا خیال جن الفاظ کا پیکر اختیار کرتا ہے وہ دو مصرعوں میں برابر منقسم نہیں ہوتے، بلکہ ایک مصرع کے کچھ الفاظ دوسرے مصرع میں جا پڑتے ہیں۔'' (۱۴)

ریختہ میں غزل کا عروج عربی، فارسی، بھاشا اور مقامی زبانوں کے اثرات کے امتزاج کے باعث ہوا۔ہند اسلامی تہذیب میں انگریزی نو آبادیات کے داخل ہونے کے ساتھ ہی فکری منظر نامہ تبدیل ہونے گا۔اس نو آبادیاتی عہد میں کلاسیکی غزل پر اعتراضات کیساتھ ساتھ قوم اور شاعری کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔اس صورت حال میں حالی ایک توانا آواز بن کر اُبھرتے نظر آتے ہیں۔محمد حسین آزاد نظم نگاری کے خواہاں ہیں اور جدت و ترقی کا انحصار انگریزی اَدب کو گردانتے ہیں۔ان سرگرمیوں کے سیاسی اثرات ظاہر ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں جو نو آبادیاتی ڈسکورس قائم ہو، وہ بحث و تمحیص کی طرف قائل کرتا رہا۔اَلطاف حسین حالی قدیم شعرا کو جھوٹ کے پوٹ اور تصنع کے دفتر قرار دیتے ہیں۔جس کی واضح مثال مدوجزر اسلام میں موجود ہے۔اُردو قصیدے کے حوالے سے سودا ایک ہی عظیم شاعر ہے، جب کہ غزل میں بے شمار نمایاں نام ہیں۔اُردو غزل کی روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ ہی غزل کا پہلا عظیم شاعر ہے۔اُردو غزل کی روایت میں ولی، میر اور غالب کا عہد کوئی اطمینان بخش نہیں تھا۔ڈاکٹر انور سدید اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''غزل میر کا میدانِ کمال ہے۔اس صنف میں میر نے ذاتی واردت سے کائناتی تجربے کی اور انسانی کرب کو تخلیقی کرب کی صورت حال دی ہے۔ان کی غزل میں دردمندی بھی ہے اور عجز و انکسار بھی۔چنانچہ یہ احساس اور جذبے کو برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ گیلی لکڑی کی طرح سلگاتی اور دبے ہوئے بوجھل جذبات کا کتھارسس یا تقلیبِ ماہیت کر دیتی ہے۔میر کی غزل نے انسانی تجربے کو ارتکازی صورت دی ہے اور اس میں ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل کی آواز بھی مجسم ہوگئی ہے۔'' (۱۵)

نو آبادیاتی عہد کے تناظر میں دیکھا جائے واضح ہوتا ہے کہ اُردو غزل کے خارج میں سیاسی بحران اور داخل میں ذات کا بحران تھا۔اُردو غزل نے بادشاہوں کے جھولے میں نشوونما نہیں پائی بلکہ ولی اور میر جیسے فقیروں نے اسے سینچا ہے۔اُردو غزل زمانے کی کش مکش اور سرد گرم دیکھ رہی تھی۔دہلی کے سیاسی و سماجی صورت حال اس کے پیش نظر رہی۔یہ وہ

وقت تھا جس میں معاشرتی وسماجی نظام بدل رہا تھا اور بادشاہت سمٹ رہی تھی۔دنیا بے ثباتی کی شکار ہوگئی تھی۔یہی وہ زمانہ ہے جس میں میر کو نیم باز آنکھوں میں شراب کی مستی محسوس ہو رہی تھی اور لب کی نازکی گلاب کی پنکھڑی معلوم ہو رہی تھی۔یہاں تک کہ میرؔ نے غزل کو ایک سطح پر مابعد الطبیعاتی بنا دیا تھا اور یہ کارنامہ کوئی بڑا شاعر ہی سرانجام دے سکتا ہے۔میرؔ کی شاعری میں باطن کا نور اور خارج کا ادراک بھی ہے۔محمد ہادی حسین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''شاعری فلسفہ،سائنس اور علوم عقلی کے نتائج فکر کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے کیوں کہ وہ بھی تو آخر انسانی تجربے کے دوسرے پہلو ہوتے ہیں بلکہ وہ اکثر اوقات ان کے اور انسانی تجربے کے دوسرے پہلوؤں کے درمیان تضاد وتخالف کو مٹا دیتی ہے۔اس کی قہرمانی قوت حسیات، جذبات، خیالات آئے دن زندگی کے معاملات فلسفے کے مجرد افکار، سائنس کے انکشافات علم ریاضی کے قواعد، طبیعات، فلکیات، حیاتیات اجتماعیت سیاسیات غرض انسانی تجربے کے کسی پہلو کو تنہا نہیں چھوڑتی بلکہ اس کو اپنی مملکت تعمیر وترقی کے لیے کسی نہ کسی کام پر معمور دیتی ہے۔''(۱۶)

غالب کی شاعری میں سراپا ناز کے ڈھول دھپے کا ذکر واضح طور پر ملتا ہے جب کہ مومن اور حسرت سے قبل محبوب اور معشوق کے لیے مذکر کا صیغہ ہی استعمال ہوتا رہا تھا۔غالب سے پہلے شعرا اپنی کیفیات اور احساسات وجذبات کو رقم کرتے رہے۔سرسید کی تحریک کے بعد نئے نظریات سامنے آتے گئے اور تفہیم کی سطح پر بھی تبدیلی آ گئی۔علامہ اقبال کے کلام میں غالب کی طرح تفکر ہے اور شعریت بھی۔اقبال انسان، کائنات اور خدا سے مکالمے کی تثلیث قائم کر رہے تھے۔اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل میں مارکسیت اور اشتراکیت کے نئے مباحث شروع ہو گئے۔اُردو غزل میں بھی سیاسی اور انقلابی رنگ در آنے لگا۔ناصر کاظمی کی شاعری تقسیم ہند اور ہجرت کے مسائل کی نوحہ بن گئی اور اس کے ساتھ ہی جدیدیت نے سر اُٹھایا۔اُردو غزل کو آغاز سے تا حال مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس میں وجودیاتی ساخت میں تبدیلی کسی طور ممکن نہیں۔اُردو غزل میں آج بھی ادبی سرگرمی، فنی طریق کار اور شعریات کا انکشاف ہے۔محمد رؤف مشرقی شعریات پر نوآبادیاتی عہد کے اثرات کا جائزہ یوں لیتے ہیں:

''نوآبادیاتی دور میں جب استعماروں نے اپنے مقتدر کلامیے سے مقامی نظامِ خیال پر دھاوا بولا تو استعمار زدہ قوم کے شعرا نے غزل کے کرداروں کی معنوی قلب ماہیت کر کے اسے جدید صورتِ حال میں اپنی کلامیاتی سرحدات کی حفاظت کے قابل بنایا اور حاکم ومحکوم کے باہمی ثقافتی رشتوں کی اس طور پر ترجمانی کی کہ اس عہد کی تاریخ کا ہر پہلو اپنے پورے جزئیات کے ساتھ اس صنف کے دامن میں سمٹ آیا ہے۔''(۱۷)

اُردو غزل میں جتنی بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں ان کا تعلق اُسلوب، فلسفہ اور علمیات کے ساتھ ہے۔اس تبدیلی کے ردِ عمل میں ترقی پسند غزل، اخلاقی غزل، جدید غزل مابعد جدید غزل کا تصور قائم ہوا ہے۔اسی طرز پر تانیثی غزل، شہری غزل، اینٹی غزل، دیہاتی غزل اور ماحولیاتی غزلیں منظر عام پر آئیں۔مذکورہ تبدیلی علمیاتی، ذوقی اور اقداری سطح پر آ گئی۔غزل میں ان وجودیات کا ہیئتی اور فکری ڈھانچہ بالکل تبدیل نہیں ہوا۔اسی طرح وہ عناصر جن سے کوئی شعر تشکیل پاتا ہے، وہ عناصر کسی دوسرے شعر میں نہیں پائے جاتے۔اگر ہیئت کے حوالے سے دیکھا جائے تو بحر اور ارکان کی تعداد

نہیں بدلتی لیکن سمعی، صوتی، صوری اور بصری سطح پر ہر ادبی ہیئت دوسری تخلیق کی ہیئت سے مختلف ہوتی ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہیئت کی وجودیت نہیں بدلتی۔ایک شعر کی تشکیل میں جو کلیدی الفاظ و معنی استعمال ہوتے ہیں وہ دوسرے شعر کے الفاظ و معنی اور خیال میں نہیں پائے جاتے۔یعنی ہر شعر کا اپنا بنیادی اور مرکزی خیال برقرار رہتا ہے۔شعر کے ہر مصرعے کی تعمیری بنیادی ایک خاص وزن اور ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ارکان کے مناسب آہنگ سے شعر میں بڑی روانی محسوس ہوتی ہے اور یہ وجودیت کا عروضی مسئلہ ہے۔یہ بات واضح رہے کہ شاعری کا کوئی بھی مطالعہ عروض کے مطالعہ کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔بنیادی طور پر شعر کی بحر کو من و عن کسی دوسرے شعر میں استعمال کی جاسکتی ہے جب کہ اس کی بصری اور صوتی ساخت کو من و عن کسی دوسرے شعر میں نہیں دہرایا جاسکتا۔یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ دو اشعار کی بحر، قافیہ اور مضمون یکساں ہو لیکن اس کے تخلیقی برتاؤ میں تبدیلی ہوگی اور تخلیقی برتاؤ میں یہ عمل اُسلوبیات کہلاتا ہے۔گوپی چند نارنگ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''جدیدیت کے یک سر ہوجانے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ مقصود بالذات فنی لوازم کو ادبی قدر کا بدل سمجھ لیا گیا، اور زیادہ توجہ عروض و آہنگ و بیان اور تکنیکی ضرورتوں پر مذکور رہتی چلی گئی اور میکانکیت نے ادبی قدر کی جگہ لے لی......دوسری یہ کہ معنی ہمیشہ زندگی کے تجربات سے، ثقافت سے یا سماج سے آتا ہے۔ظاہر ہے کہ اَدبی قدر کا مجرد تصور انتہائی مغالطہ آمیز گمراہ کن ہے۔اَدبی قدر معنی کے جزو مد سے اس قدر مربوط ہے کہ جو اَدبی وسیلہ معنی کے حسن کو جتنا زیادہ قائم کرتا ہے، یعنی جتنی زیادہ تاثیر یا جمالیاتی اثر پیدا کرتا ہے۔وہ اتنا ہی زیادہ اہم ہے۔ورنہ مجرد فنی لوازم، مثلاً استعارہ یا علامت یا پیکر یا تشبیہ یا اوزان محض فنی تکنیکیں ہیں۔''(۱۸)

کلاسیکی شعریات میں ہجر و وصال کے شعری تصورات کے باعث اُردو شاعری میں متنوع موضوعات پیدا ہو چکے ہیں۔کلاسیکی غزل کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شعر تخلیق کرنے کے فنی وسائل اُسلوب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ایک عرصہ تک اُردو شاعری میں ایہام کا چرچا رہا اور جدیدیت نے تاثراتی، جذباتی اور کیفیاتی اظہار کے لیے تجریدیت کو تقویت دی۔اس دور میں اُردو غزل میں ہر طرح کے تجربات کا استقبال کیا گیا۔جدیدیت میں تجربات کے حوالے سے ظفر اقبال کا اہم نام ہے۔اینٹی غزل اور نئی جمالیات کی تلاش کے باعث لسانی توڑ پھوڑ کا عمل ہوا جس سے واضح ہوا کہ اظہار کی اُسلوبیاتی آزادی پر کسی طور بھی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔اس طرح غزل جدید غزل کلاسیکی شعریات میں نئے رجحانات اور نئی روایت کا بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔اُردو کلاسیکی غزل کے معنوی تصورات جدید غزل کے لیے نامیاتی وحدت ثابت ہوئے۔معنیاتی (تشبیہ، استعارہ، کنایہ، علامت، مجاز مرسل) اور بدیعیاتی (تضاد، تلمیح، مراعاۃ النظیر، تکرار، حسن تعلیل، مبالغہ، تجسیم، تجرید) جیسے مباحث میں اضافہ ہوا۔اسی طرح معنی خیزی کے وسائل (معنی آفرینی، خیال بندی، مضمون آفرینی، کیفیت اور شور انگیزی) کے حوالے سے شمس الرحمان فاروقی نے خاص توجہ دی۔ان کے قلم نے کلاسیکی شعریات کی معاصر تفہیم میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

نوآبادیاتی عہد میں بے شمار ایسے نام لیے جاسکتے ہیں جن کی تخلیقات نے نوآبادیاتی فکر کو مستحکم کرنے اور اس کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا، لیکن اس عہد میں ایسے تخلیق کار اور ادیب بھی کثرت سے موجود تھے جو مسلسل مغربی استعماریت اور سامراجیت کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔اس عہد میں ان ادیبوں کی پوری فہرست تیار کی جاسکتی ہے،

جنھوں نے ادبی اور تنقیدی نظریہ سازی کی بنیادیں فراہم کیں۔ برطانوی سامراج نے ہندوستانیوں کو اپنے رنگ میں اس قدر رنگ دیا کہ اُن کی اپنی تہذیب اور روایت ان کے لیے بے وقعت اور ناقابلِ تقلید محسوس ہونے لگی۔ انیسویں صدی میں مشرقی شعریات پر نوآبادیاتی عہد کے اثرات انتہائی کارگر ثابت ہوئے، جنھوں نے مشرقی شعریات کی فکر، ساخت اور موضوعات کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اس عہد کے تنقیدی نظریات مشرقی شعریات کی بنیاد بنے۔ نوآبادیاتی فکر کے آغاز، اسباب اور اس کے محرکات ہندوستانی ادب اور تاریخ کی روایت کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ علمدار حسین بخاری، جدید اَدب کا سیاق (ایک پس نوآبادیاتی مطالعہ)، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۳۷

۲۔ محمد عامر سہیل، نو آبادیات و مابعد نوآبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق)، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۲۸

۳۔ اختر انصاری، مابعد جدیدیت۔اطلاقی جہات، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۸۹

۴۔ اختر انصاری، حالی اور نیا تنقیدی شعور، (علی گڑھ: ادارہ شعر و اَدب، ۱۹۷۵ء)، ص ۵۵

۵۔ ناصر عباس نیر، ما بعد جدیدیت۔اطلاقی جہات، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۹۰

۶۔ خلیل الرحمان اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۰۴

۷۔ آلِ احمد سرور، اُردو شعریات، (سری نگر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۹۷۔۱۹۸

۸۔ خلیل الرحمان اعظمی، مضمون: شبلی کا تنقیدی مسلک، مشمولہ: مضمون نو، ص ۴۲

۹۔ عبادت بریلوی، اُردو تنقید کا ارتقا، (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۸۶

۱۰۔ وزیر آغا، اُردو شاعری کا مزاج، (لاہور: مجلس ترقی اَدب، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۰۷

۱۱۔ یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، (لاہور: اظہار سنز، ۱۹۶۹ء)، ص ۱۶۴

۱۲۔ انور جمال، اَدبی اصطلاحات، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء)، ص ۸۰

۱۳۔ عنوان چشتی، اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، (نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۷۵ء)، ص ۳۶۔۳۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۵۔ انور سدید، اُردو اَدب کی تاریخ، (لاہور: عزیز بک ڈپو، ۲۰۲۰ء)، ص ۱۵۳

۱۶۔ محمد ہادی حسین، شاعری اور تخیل، (لاہور: مجلس ترقی اَدب، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۳

۱۷۔ محمد عامر سہیل، نو آبادیات و مابعد نوآبادیات (نظریہ، تاریخ، اطلاق)، ص ۲۳۶

۱۸۔ گوپی چند نارنگ، اُردو ما بعد جدیدیت پر مکالمہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۴۔۵۵